میر تقی میرؔ

(شخصیت، شاعری اور منتخب کلام)

ترتیب وتہذیب

ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی

------پبلشر------

رحمانی پبلیکیشنز

1032 انصار روڈ، ڈاکٹر سراج احمد کے دواخانے کے سامنے، اسلامپورہ، مالیگاؤں،

423203 مہاراشٹر Mob : 9890801886 / (02554)234460

نام کتاب	:	میر تقی میرؔ
ترتیب وتہذیب	:	ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی
سالِ اشاعت	:	۲۰۱۴ء
تعداد	:	ایک ہزار
صفحات	:	64
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	شاہد اختر، حرا کمپیوٹرس، مالیگاؤں
طباعت	:	شارپ آفسیٹ پریس، مالیگاؤں
قیمت	:	40/-

----- Publisher-----

Rahmani Publication

1032,Islampura,Malegaon-423203(Dist-Nasik)

Mob : 9890801886 / (02554)234460

عرض ناشر

رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں اب محتاجِ تعارف نہیں رہا جس نے ادبِ اطفال پر مختصر سے عرصے میں سیکڑوں کتابیں شائع کیں اور انہیں ملک بھر میں پھیلا دیا اس ادارہ نے ہندوستان کے مشہور و معروف قلمکار اور ادبا کی کتابیں شائع کیں اور مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں طبع کیں۔ مزید یہ کہ تاریخی شخصیات پر بھی بچوں کے معیار کے مطابق کتابیں شائع کرنے کا بیڑہ بھی اٹھا رکھا ہے۔ تاریخی شخصیات میں بہت سی شخصیات پر یا تو بہت ضخیم کتابیں دستیاب ہیں یا پھر بہت سی اہم شخصیات کے متعلق انتہائی مختصر تذکرے ملتے ہیں۔ ہمارے ادارے نے ملک بھر کے نامور قلمکار اور ماہر ادیبوں سے رابطہ کیا۔ اور منتخب شخصیات پر لکھنے کی ذمہ داری ڈالی۔ الحمد اللہ! بہت کم عرصے میں اب تک سیکڑوں شخصیات پر کتابیں منظر عام پر لائی گئیں۔ اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

اردو ادب بالخصوص زبان کی خدمت کرنے والے ہمارے ماضی کے شعرا و ادبا کی حیثیت تاریخی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی نظموں، غزلوں، گیتوں، کہانیوں، افسانوں اور مضامین کے ذریعے اردو زبان و ادب کے فروغ میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ جگ ظاہر ہے۔ ادارے نے یہ طے کیا ہے کہ تاریخی شخصیات سیریز کے ذیل میں ایک ضمنی کڑی شروع کرتے ہوئے ان شاعروں اور ادیبوں کے تعارف اور ان کے منتخب کلام کو بھی منظرِ عام پر لایا جائے۔

لہٰذا کلاسیکل شعرا کے تعارف اور ان کے منتخب کلام پر مشتمل یہ سیریز پیش کی جارہی ہے۔ تاریخی شخصیات سیریز کی طرح مرتبین کے تبصرے و تجزیے پر آپ اختلاف تو کرسکتے ہیں لیکن اس سلسلے کی اہمیت کا انکار شاید نہ کرسکیں۔ ضروری نہیں کہ مرتبین کے تمام تبصروں اور تجزیوں سے ہمارا ادارہ اتفاق رکھے۔ بہر کیف سبھی مرتبین مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شاعروں اور ادیبوں میں چند قابل ذکر امیر خسرو، داغ دہلوی، مولانا اسماعیل میرٹھی، امیر مینائی، مولانا حسرت موہانی، آتش لکھنوی، فانی بدایونی وغیرہ ہیں۔

ہمارے ادارے نے اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور وطن عزیز کے نونہالان کے لیے اردو کے گراں قدر جواہر پاروں کو شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ لہٰذا سرپرست و اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کے ہاتھوں تک ان کتابوں کو پہنچائیں اور انہیں ان کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دیں، تاکہ نئی نسل بھی اردو کے کلاسیکل شاعروں اور ان کے کلام سے واقف ہوسکے۔

ناشر

میر تقی میرؔ۔ شخصیت اور شاعری

(پیدائش:1723ء/ وفات:1810ء)

محمد تقی المعروف میر تقی میرؔ اردو کے عظیم شاعر تھے۔ اردو شاعری میں میر تقی میرؔ کا مقام بہت اونچا ہے انہیں ناقدین و شعرائے متاخرین نے ''ناخدائے سخن'' کے خطاب سے نوازا۔ وہ اپنے زمانے کے ایک منفرد شاعر تھے آپ کے متعلق اردو کے عظیم الشان شاعر مرزا غالب نے لکھا ہے ؎

ریختے کے تمہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میر تقی میر آگرہ میں 1723ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد علی تھا لیکن علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔ اور درویش گوشہ نشین تھے۔ میر نے ابتدائی تعلیم والد کے دوست سید امان اللہ سے حاصل کی۔ میر ابھی نو برس کے تھے کہ وہ چل بسے ان کے بعد ان کے والد نے تعلیم و تربیت شروع کی۔ مگر چند ہی ماہ بعد ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ یہاں سے میر کی زندگی میں رنج والم کے طویل باب کی ابتداء ہوئی۔

ان کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے اچھا سلوک نہ کیا۔ تلاش معاش کی فکر میں دہلی پہنچے اور ایک نواب کے ہاں ملازم ہوگئے۔ مگر جب نواب موصوف ایک جنگ میں مارے گئے تو میر آگرہ لوٹ آئے۔ لیکن گزر اوقات کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ چناں چہ دوبارہ دہلی روانہ ہوئے اور اپنے خالو سراج الدین آرزوؔ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ سوتیلے بھائی کے اکسانے پر خان آرزوؔ نے بھی پریشان کرنا شروع کردیا۔ کچھ غمِ دوراں کچھ غمِ جاناں، سے جنون کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

میر کا زمانہ شورشوں اور فتنہ وفساد کا زمانہ تھا۔ ہر طرف صعوبتوں کو برداشت کرنے کے بعد

بالآخر میر گوشۂ عافیت کی تلاش میں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ اور سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے بعد لکھنو پہنچے۔ وہاں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ نواب آصف الدولہ نے تین سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور میر آرام سے زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن تند مزاجی کی وجہ سے کسی بات پر ناراض ہو کر دربار سے الگ ہو گئے۔ آخری تین سالوں میں جوان بیٹی اور بیوی کے انتقال نے صدمات میں اور اضافہ کر دیا۔ آخر اقلیمِ سخن کا یہ حرماں نصیب شہنشاہ 1810ء میں لکھنو کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

میر کی زندگی کے بارے میں معلومات کا اہم ذریعہ ان کی سوانح عمری ہے۔ جوان کے بچپن سے لکھنؤ میں ان کے قیام کے آغاز کی مدت پر محیط ہے۔ میر نے اپنی زندگی کے چند لمحے مغل دہلی میں صرف کیے۔ اس وقت وہ پرانی دہلی میں جس جگہ رہتے تھے اسے کوچہ چیلان کہا جاتا تھا۔

انہوں نے اپنے درد کو چند اشعار میں یوں بیان کیا ہے ؎

کیا بود و باش پوچھے ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میر تقی میر غم کا شاعر

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا
شعر میرے بھی ہیں پُر درد وَ لیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

بہ قول مولوی عبدالحق: "اُن کا ہر شعر ایک آنسو ہے اور ہر مصرع خون کی ایک بوند ہے۔" ایک اور جگہ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں: "انہوں نے سوز کے ساتھ جو نغمہ چھیڑا ہے اس کی مثال دنیائے اردو میں نہیں ملتی۔"

ہر شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے اردگرد رونما ہونے والے واقعات، حادثات، اس کی ذاتی زندگی میں پیش آنے والے تجربات اور اس سلسلے میں اس کے تاثرات ہی دراصل اس کی شاعری اور فن کے رخ کا تعین کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ماحول اور معاشرے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ لاشعوری طور پر شاعر اپنی فکر کا رخ موڑتا چلا جاتا ہے اور

یوں اس کی شاعری وقت کی رفتار کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

میر تقی میر ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے جو سیاسی، سماجی، ملکی اور معاشی اعتبار سے سخت انتشار اور افراتفری کا دور تھا۔ مغل مرکز کمزور پڑ چکا تھا۔ ہندوستان کے بہت سے صوبے خود مختار ہو چکے تھے پورا ملک لوٹ مار کا شکار تھا۔ بیرونی حملہ آور آئے دن حملے کرتے اور عوام و خواص کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے۔ لوگ بھوکے مرنے لگے اور دولت لٹنے سے اقتصادی بدحالی کا دور شروع ہوا۔

میر اپنے اس دور کے احساس زوال اور انسانی الم کے مظہر ہیں۔ ان کی شاعری اس تمام شکست و ریخت کے خلاف ایک غیر منظم احتجاج ہے۔ میر کے تصورِ غم کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں کہ "میر کا سب سے بڑا مضمونِ شاعری ان کا غم ہے۔ غم والم کو میر کے مضامین شاعری میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ غم میر کا ذاتی غم بھی تھا اور یہی انسان کی ازلی اور ابدی تقدیر کا غم بھی تھا۔ یہ سارے غم میر کی شاعری میں جمع ہو گئے ہیں۔"

غم و حزن

میر کا تصور، زندگی کے بارے میں بڑا واضح ہے کہ ان کا زندگی کی بارے میں نقطۂ نظر حزنیہ تھا۔ حزن ایک ایسے غم کا نام ہے جو اپنے اندر تفکر اور تخیلی صلاحیتیں بھی رکھتا ہے۔ یہ غم ذاتی مقاصد اور ذاتی اغراض کا پرتو نہیں رکھتا۔ اس غم میں تو سوچ، غور و فکر اور تفکر کو دخل ہے۔ میر کے متعلق یہ کہنا بھی درست نہیں کی میر قنوطی شاعر ہیں یا محض یاسیت کا شکار ہیں۔ محض یاس کا شاعر ہونا کوئی بڑی بات نہیں، اصل بات تو یہ ہے کی انسان یاس و غم کا شکار ہونے کے باوجود زندگی سے نباہ کیسے کرتا ہے۔ یہی نباہ اس کے تصورِ زندگی کی تشکیل کرتا ہے۔ میر کا تصورِ زندگی مایوس کن نہیں صرف اس میں غم والم کا ذکر بہت زیادہ ہے۔ مگر یہ غم والم ہمیں زندگی سے نفرت نہیں سکھاتا بلکہ زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اس میں زندگی کی بھرپور توانائی کا احساس ہوتا ہے ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

چشم رہتی ہے اب پُر آب بہت
دل کو میرے ہے اضطراب بہت
متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتش دل
ایک دو اشک تو اور آگ لگا دیتے ہیں

میر کا تصورِ غم

میر کا تصورِ غم تخیلی اور فکری ہے۔ یہ قنوطیت پیدا نہیں کرتا۔ اس کے ہوتے ہوئے میر کی شاعری میں توازن اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ شکستگی کا احساس نہیں ہوتا اور ضبط، سنجیدگی اور تحمل ملتا ہے۔ وہ غم سے سرشار ہو کر اسے سرور اور نشاط بنا دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری ان کے تصورات غم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میر نے غمِ عشق اور اس کے ساتھ غم زندگی کو ہمارے لیے راحت بنا دیا ہے۔ وہ درد کو ایک سرور اور الم کو ایک نشاط بنا دیتے ہیں۔ میر کے کلام کے مطالعہ سے ہمارے جذبات و خیالات اور ہمارے احساسات و نظریات میں وہ ضبط اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے۔ جس کو صحیح معنوں میں تحمل کہتے ہیں ؎

ہر صبح غموں میں شام کی ہے میں نے
خوں نابہ کشی مدام کی ہے میں نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے میں نے

میر کی دردمندی

میر کے ہاں درمندی ان کے فلسفۂ غم کا دوسرا نام ہے۔ اگرچہ لفظ فلسفہ انہوں نے استعمال ہی نہیں کیا، مگر اس سے مراد اُن کی یہی ہے۔ دردمندی سے مراد زندگی کی تلخ حقیقتوں کا اعتراف و ادراک اور مقدور بھر ان تلخیوں کو دور کرنے کی کوشش کا نام ہے۔ یہ درمندی ان کی زندگی کے تضادات سے جنم لیتی ہیں۔ درمندی کا سرچشمہ دل ہے۔ میر کے یہ اشعار ذہن میں رکھیے ؎

آبلے کی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
درمندی میں کٹی ساری جوانی اپنی
نہ درد مندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد
چشم رہتی ہے اب پُر آب بہت
دل کو میرے ہے اضطراب بہت

دردمندی کے محرکات

میر کا دور شدید ابتری کا دور تھا۔ زندگی کے مختلف طبقوں میں اقدار کی بے آبروئی ہو رہی تھی۔ انسانی خون کی ارزانی، دنیا کی بے ثباتی اور ہمہ گیر انسانی تباہی نے انسانوں کو بے حد متاثر کیا۔ میر اس تباہی کے محض تماشائی نہ تھے بلکہ وہ خود اس تباہ حال معاشرہ کے ایک رکن تھے۔ جو صدیوں کے لگے بندھے نظام کی بربادی سے تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر کر رہ گیا تھا۔ اور اب اس کو جوڑنا ممکن نہ رہا تھا۔ میر نے اس ماحول کے اثرات شدت سے محسوس کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں اس تباہی کے نقوش ملتے ہیں۔ لٹے ہوئے نگروں، شہروں اور اجڑی ہوئی بستیوں کے حالات، بجھے ہوئے دلوں کی تصویریں، زمانے کے گرد و غبار کی دھنڈلاہٹیں، تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں میر کے ہاں موجود ہیں ؎

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک
پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
دل کی ویرانی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

بلند حوصلگی

بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ: ” میر کو زندگی سے بیزار شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ ان کا غم بعد میں آنے والے شاعر، فانی کے غم سے مختلف ہے جس کی تان ہمیشہ موت پر ٹوٹتی ہے۔ ان کا غم سودا سے بھی مختلف ہے۔ ان کا غم ایک مہذب اور درد مند آدمی کا غم ہے جو زندگی کے تضاد کو گہرے طور سے محسوس کرتا ہے کہ ایسی دلکش جگہ اور اتنی بے بنیاد اور محروم۔“

غم و الم کے اس عالم میں میر بے حوصلہ نہیں ہوتے۔ وہ سپاہیانہ دم خم رکھتے ہیں۔ فوجی ساز و سامان کے استعاروں میں مطلب ادا کر کے زندگی کا ایسا احساس دلاتے ہیں جس میں بزدلی بہر حال عیب ہے۔ وہ رویہ جسے اہلِ تذکرہ بے دماغی یا بد دماغی کہتے ہیں وہ دراصل وہ احتجاجی روش ہے جو ہر سپاہی کا شیوہ ہے ؎

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا
بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے
حوصلہ شرط عشق ہے ورنہ
بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا

دنیا کی بے ثباتی

بے ثباتی دنیا کا احساس اردو شاعری میں بہت عام ہے۔ اس موضوع پر تقریباً سبھی شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن دبستان دہلی کے شعرا کے ہاں بے ثباتی کا احساس زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ خصوصاً میر تقی میر کی تمام شاعری میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بڑے واضح الفاظ میں ملتا ہے۔ جس کی اصل وجہ اُس دور کے غیر یقینی اور ہنگامی حالات تھے۔ جس کی وجہ سے اُن کی شاعری میں دنیا سے بے زاری اور بے ثباتی کے موضوعات پروان چڑھے ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میر بھی اک بلبلا تھا پانی کا

دلّی کی بربادی کا غم

بہ قول ڈاکٹر غلام حسن: "شاعروں نے دل کے استعارے میں اس عہد کے سیاسی اور سماجی احوال کو سمو کر بڑے بلیغ کنائے سے کام لیا ہے۔ جس طرح انسانی جسم کی ساری نقل و حرکت کا مرکز و محور دل ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک سلطنت کا مرکز و محور اس کا دارالحکومت ہوتا ہے۔ زیرِ نظر دور میں ہندوستان کا مرکز سلطنت شہر دلی تھا۔ دلی جو صدیوں سے اس ملک کے دل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔۔۔ دلی کی تباہی کو شاعروں نے کنایتاً دل کی ویرانی و بربادی سے تشبیہ دے کر سارے جسم یعنی کل ملک کی تباہی کی داستان بیان کی ہے۔"

میر نے دوسرے شعرا کی طرح یہ تمام خونی واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ میر کی شاعری پر خون کے یہ دھبے آج تک نمایاں ہیں ؎

دلی کے نہ تھے کوچے یہ اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
خاک بھی سر پر ڈالنے کو نہیں
کس خرابے میں ہم ہوئے آباد
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

سادگی، خلوص، صداقت

میر نے فنی خلوص کو پوری صداقت سے استعمال کیا ہے۔ فنی خلوص سے یہ مراد ہے کہ شاعر

زندگی کے واقعات کو جس طرح دیکھتا ہے، اسی طرح بیان کرے۔ میر کا انداز اسی لیے مقبول ہے کہ اس میں صداقت اور خلوص اور تمام باتیں بے تکلفی کے انداز میں کہی گئی ہیں۔ میر نے خیال بند شاعروں کی سی معنی آفرینی سے کام نہیں لیا۔ محض تخیل کے گھوڑے نہیں دوڑائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر عوام کا شاعر ہے۔ اس کے آس پاس کی زندگی سے درد و غم کے مضامین کے چشمے ابل رہے تھے۔ میر نے انہی مضامین کو سادہ الفاظ میں بے تکلف انداز میں پیش کیا۔ میر کے خلوص و صداقت کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ؎

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم کو میں دکھا لایا
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتداء ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

خطابیہ انداز

میر کو خطاب اور گفتگو کا انداز بڑا پسند ہے۔ کبھی وہ خود سے مخاطب ہو کر "باتیں" کرتے ہیں اور کبھی کسی دوسرے شخص سے۔ کبھی ان کا تخاطب بلبل سے ہے اور کبھی شمع و پروانہ سے۔ ان تمام حالتوں میں شعر میں بات چیت اور بے تکلفی کا رنگ بہر حال قائم رہتا ہے۔ ایک مانوس اور محبت بھری آواز کانوں سے ٹکراتی ہے جو اپنے پیرایہ ادا کی کشش سے قاری یا سامع کو فوراً اپنے حلقہ اثر میں لے لیتی ہے اور وہ خود بخود میر صاحب کی ان بے ساختہ اور پرخلوص "باتوں" سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے ؎

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے
بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

میر کا طنز

میر کا طنز ان کی طبیعت کا آئینہ ہے۔ جب کوئی بات طنز کے ساتھ کہتے ہیں تو اس سے محض بے تکلفی نہیں ٹپکتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عالم یا اس تجربہ سے گزر چکے ہیں۔ ان کا طنز اس شدید اور عمیق تعلق کا نتیجہ ہے جو بے تکلفی کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے اور پھر عمر بھر قائم رہتا ہے۔ ان کے طنز میں ایک مدہم سی تلخی ہوتی ہے جو پختہ مغزی کی علامت ہوتی ہے۔ ان کے طنز میں غالب کی تیزی کی جگہ ایک عجب پرکیف نرمی ہوتی ہے ؎

ہوگا کسو دیوار کے سائے تلے یہ میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں
حال بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی ہے

تشبیہات واستعارات

میر نے اپنے شیوہ گفتار کو زیادہ موثر اور دلکش بنانے کے لئے تشبیہ واستعارے کا بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے۔ یہ تشبیہات مردہ نہیں بلکہ ان کے اندر زندگی دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ ان کے خالق کے خون میں گرمی اور حرارت ہے اور وہ پوری صداقت اور پورے فنی خلوص

سے اپنی زندگی بھر کے تجربات وتاثرات کو ان تشبیہات واستعارات کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔ ان میں کہیں بھی تصنع یا بناوٹ کا احساس نہیں ہو پاتا ؎

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

ترنم اور موسیقیت

میر کے شاعرانہ انداز کی غنائیت اور موسیقیت اپنے اندر فنی دلکشی کے بہت سے پہلو رکھتی ہے۔ میر کے انداز کی نغمگی اور ترنم مسلم ہے۔ اور یہی میر کی عظمت کا راز ہے۔ ان کا کمال فن یہ ہے کہ وہ مختلف خیالات کے اظہار کے لیے مختلف بحروں کا انتخاب کر کے نغمگی پیدا کرتے ہیں۔ فارسی مروجہ بحروں کے استعمال کے ساتھ ساتھ میر نے ہندی کے پنگل کو اردو غزل کے مزاج کا حصہ بنا کر ہم آہنگی کی صورت دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں بڑی کیف آور اور اثر انگیز غنائیت وموسیقی پیدا ہوتی ہے ؎

پتّہ پتّہ ، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

تصوف

میر کی شاعری کے فکری عناصر میں تصوفانہ رنگ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کے باپ اور

چچا صوفیانہ مزاج کے مالک تھے اور رات دن جذب و مستی کی کیفیات میں سرشار رہتے تھے۔ میر نے ان بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ وہ بھلا کس طرح صوفیانہ تجربہ سے الگ رہ سکتے تھے۔ ان کے ہاں تصوف کا تجربہ محض روایتی نہیں ہے یہ رسمی بھی نہیں ہے، اس تجربے نے میر کے ذہن و فکر کی تہذیب پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ وہ زندگی کو کسی عام انسان کی طرح نہیں دیکھتے، ان کی نظر صاف دل صوفی کی نظر ہے ؎

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

حکیمانہ انداز

عام اخلاقی مضامین بھی ہمارے تصوف کے اہم مسائل ہیں۔ یہ لوگ نیکی، شرافت، دیانت، صدق و امانت اور دیگر چھوٹے چھوٹے اخلاقی مسائل پر اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں کہ ایک طرف تو ان مسائل کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور دوسرے ان کا انداز اس قدر دلنشین ہوتا ہے کہ قاری پر اثر بھی پڑتا ہے۔ میر تقی میر کی شاعری میں حکیمانہ انداز پایا جاتا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے ؎

یہ توہّم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا
سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

تصوّرِ محبوب

یہ بات تو طے ہے کہ میر نے ایک گوشت پوست کے زندہ و متحرک محبوب سے عشق نہیں،

بھرپور عشق کیا تھا۔ اور محبوب سے ان کے احساسِ جمال، قوتِ تخیل اور تصورِ حسن پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کا محبوب خود حسن و نور کا منبع ہے اور روشنی کی طرح شفاف۔ میر کا محبوب صرف روشنی ہی نہیں بلکہ جسم، خوشبو اور رنگ و بو کا پیکر بھی ہے۔ وہ مادی کثافتوں سے منزہ اور حسن محض ہے ؎

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

تصوّرِ عشق

میر کے ہاں عشق آداب سکھاتا ہے۔ محبوب کی عزت و تکریم کا درس دیتا ہے۔ اگرچہ اس کا انجام ہمیشہ المیاتی اور دردناک ہوتا ہے پھر بھی میر کو اس عشق سے پیار ہے۔ یہ عشق ان کی زندگی کا حاصل ہے۔ اسی عشق سے میر نے زندگی کا سلیقہ اور حوصلہ سیکھا ہے۔ اسی عشق نے ان کی زندگی میں حرکت و عمل اور چہل پہل پیدا کی۔ میر کے خیال میں زندگی کی ساری گہما گہمی اور گونا گونی اسی عشق کی وجہ سے ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یہ کارخانہ قدرت بے کار، خاموش، بے حرکت اور بے لذت ہوتا۔ تصورِ عشق کے حوالے سے ان کے نمائندہ اشعار درج ذیل ہیں ؎

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا
محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
ہم طورِ عشق سے کچھ واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ہے

سہلِ ممتنع

میر کی سہل ممتنع کے بارے میں اثر لکھنوی کہتے ہیں کہ" زندگی کا شائد ہی کوئی پہلو ہو جس کی مصوری میر نے بہترین الفاظ میں اور موثر ترین پیرائے میں نہ کی ہو ان کے اشعار سہل ممتنع ہیں۔"

؎

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہا ن دیگر تھا
سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا
سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

احساس برتری

میر کی شاعری کا ایک مخصوص رنگ ہے اور انداز شعر گوئی کی کیفیات ہیں جس نے تمام شاعروں کو بے حد متاثر کیا اور سارے شاعروں نے اس رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لئے میر احساس برتری کو سامنے لاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؎

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا
گفتگو ریختی میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے
پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

بہ قول سید عبداللہ: "بعض صاحب کمال ایسے ہوتے ہیں جن کے فن کی نمایاں خصوصیت نہ صرف اپنے دور کو متاثر کرتی ہے بلکہ مستقبل میں بھی لوگ ان کے طرز خاص کو مانتے ہیں میر بھی

ایسے ہی صاحب کمال ہیں۔"

مجموعی جائزہ

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ: "میر تقی میر سرتاج شعرائے اردو ہیں ان کا کلام اسی ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا جیسے سعدی کا کلام فارسی میں، اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو میر کا نام اس فہرست میں ضرور داخل ہوگا۔"

بہ قول رشید احمد صدیقی: "غزل شاعری کی آبرو ہے اور میر غزل کے بادشاہ ہیں۔" ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "میر کی بات دل سے نکلتی ہے اور سامع کے دل میں جگہ کر لیتی ہے۔"

ناخدائے سخن میر تقی میر کی شاعری کے اس تجزیے کے بعد آئیے آئندہ صفحات پر اُن کی منتخب غزلیں ملاحظہ کیجیے:

(ڈاکٹر) مُشاہدؔ رضوی، مالیگاؤں
+919420230235 / +919021761740

☆☆☆

حمدیہ غزل

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اُس رند کی بھی رات گزر گئی جو عور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
(ق)
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر!
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا
☆☆☆

نعت پاک

جرم کی خو شرم گینی یارسول
اور خاطر کی حزینی یارسول
کھینچوں ہوں نقصان دینی یارسول
تیری رحمت ہے یقینی یارسول
رحمۃللعالمینی یارسول! ہم شفیع المذنبینی یارسول

ہورہے ہیں ہم جو دوزخ کے حطب
سر پہ ہم اعمال لائے ہیں غضب
رکھتے ہیں چشمِ عنایت تجھ سے سب
تجھ سوا کس سے کہیں احوال اب
رحمۃللعالمینی یارسول! ہم شفیع المذنبینی یارسول

جب تلک تاثیر کا تھا کچھ گماں
گر قرآں خواں میرؔ تھے گر سبحہ خواں
وقت یک ساں تو نہیں اے دوستاں
اب یہی ہے ہر زباں وردِ زباں
رحمۃللعالمینی یارسول! ہم شفیع المذنبینی یارسول

☆☆☆

اس عہد میں، الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا

امیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قامت کو کیا ہوا

اس کے گئے پر ایسی گئی دل سے ہم نشیں
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل
اے چشم جوشِ اشکِ ندامت کو کیا ہوا

جاتا ہے یار تیغ بہ کف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

تھی صَعت عاشقی کی ہدایت ہی میرؔ پر
کیا جانیے کہ حالِ نہایت کو کیا ہوا

☆☆☆

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے ٹیڑھے ترچھے تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا مے خانے میں
جُبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بُھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت ہے
استغنا کی چوگنی اُن نے جُوں جُوں میں ابرام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

☆☆☆

بے تاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

پودا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا
اپنے کیے کا اُن نے ثمرہ شتاب دیکھا

دل کا نہیں ٹھکانا بابت جگر کی گم ہے
تیرے بلا کشوں کا ہم نے حساب دیکھا

آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت
اُس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میرؔ صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا!

☆☆☆

کل شبِ ہجراں تھی لب پر نالۂ بیمارانہ تھا
شام سے تا صبح دم بالیں پہ سر یک جا نہ تھا

شہرۂ عالم اُسے یمنِ محبت نے کیا
ورنہ مجنوں ایک خاک افتادۂ ویرانہ تھا

منزل اس مہ کی رہا جو مدتوں اے ہم نشیں
اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا

اک نگاہِ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں
وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا

روز و شب گزرے ہے پیچ و تاب میں رہتے تجھے
اے دلِ صد چاک کس کی زلف کا تو شانہ تھا

یاد آیا مے کہ اپنے روز و شب کی جائے باش
یا درِ بازِ بیاباں یا درِ مے خانہ تھا

بعد خوں ریزی کے مدت بے حنا رنگیں رہا
ہاتھ اس کا جو مرے لوہو میں گستاخانہ تھا

غیر کے کہنے سے مارا اُن نے ہم کو بے گناہ
یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

صبح ہوتے وہ بنا گوش آج یاد آیا مجھے
جو گرا دامن پہ آنسو گوہرِ یک دانہ تھا

شب فروغِ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست
شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

رات اُس کی چشمِ میگوں خواب میں دیکھی تھی میں
صبح سوتے سے اُٹھا تو سامنے پیمانہ تھا

رحم کچھ پیدا کیا شاید کہ اس بے رحم نے
گوش اُس کا شب ادھر تا آخرِ افسانہ تھا

میرؔ بھی کیا مستِ طافح[1] تھا شرابِ عشق کا
لب پہ عاشق کے ہمیشہ نعرۂ مستانہ تھا
☆☆☆(1 طافح: نشۂ شراب کا بدمست)

بارہا گور دل جھکا لایا
اب کے شرطِ وفا بجا لایا

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم میں مَیں دکھا لایا

دل کہ اک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

دل مجھے اُس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا
☆☆☆
جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تُو کب تک میرے منھ کو دھوتا رہے گا

بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں!
کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تُو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا
☆☆☆

شبِ ہجر میں کم تظلّم کیا
کہ ہمسائگاں پر ترحّم کیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات!
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

زمانے نے مجھ جُرعہ کش کو ندان
کِیا خاک و خشتِ سرِ خم کیا

جگر ہی میں یک قطرۂ خوں سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

کسو وقت پاتے نہیں گھر اُسے
بہت میرؔ نے آپ کو گم کیا

☆☆☆

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

قسم جو کھایئے تو طالعِ زلیخا کی
عزیز مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے مے خانے
نگاہِ مست نے ساقی کی انتقام لیا

وہ کج روش نہ ملا راستی میں مجھ سے کبھی
نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا سلام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

☆☆☆

کیا کہیں اپنی اُس کی شب کی بات
کہیے ہووے جو کچھ بھی ڈھب کی بات

اب تو چپ لگ گئی ہے حیرت سے
پھر کھلے گی زبان جب کی بات

نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات

کس کا روئے سخن نہیں اُودھر
ہے نظر میں ہماری سب کی بات

ظلم ہے قہر ہے قیامت ہے
غصے میں اُس کے زیرِ لب کی بات

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانیے یہ کب کی بات

گو کہ آتش زباں تھے آگے میرؔ
اب کی کہیے گئی وہ تب کی بات

☆☆☆

کاش اٹھیں ہم بھی گنہ گاروں کے بیچ
ہوں جو رحمت کے سزاواروں کے بیچ

چشم ہو تو آئنہ خانہ ہے دہر
منھ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ

ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں
شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ

عاشقی و بے کسی و رفتگی
جی رہا کب ایسے آزاروں کے بیچ

یارو مت اُس کا فریبِ مہر کھاؤ
میرؔ بھی تھے اس کے ہی یاروں کے بیچ

☆☆☆

مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھ کر
جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر

افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے
پھر مر گئے ترے تئیں اک بار دیکھ کر

دیکھیں جدھر وہ رشکِ پری پیشِ چشم ہے
حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر

جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

تیرے خرامِ ناز پہ جاتے ہیں جی چلے ؟
رکھ ٹک قدم زمیں پہ ستم گار دیکھ کر

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میرؔ
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

☆☆☆

ہوتا نہیں ہے باب اجابت کا وا ہنوز
بسمل پڑی ہے چرخ پہ میری دعا ہنوز

غنچے چمن چمن کھلے اس باغِ دہر میں
دل ہی مرا ہے جو نہیں ہوتا ہے وا ہنوز

احوال نامہ بر سے مرا سن کے کہہ اُٹھا
جیتا ہے وہ ستم زدہ مہجور کیا ہنوز

توڑا تھا کس کا شیشۂ دل تُو نے سنگ دل
ہے دل خراش کُوچے میں تیرے صدا ہنوز

بے بال و پر اسیر ہوں کنجِ قفس میں میرؔ
جاتی نہیں ہے سر سے چمن کی ہوا ہنوز

☆☆☆

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ
کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ

تم اور ہم سے محبت تمہیں خلاف خلاف
ہم اور اُلفتِ خوبِ دگر دروغ دروغ

غلط غلط کہ رہیں تم سے ہم تنک غافل
تم اور پوچھو ہماری خبر دروغ دروغ

فروغ کچھ نہیں دعوے کو صبحِ صادق کے
شبِ فراق کو کب ہے سَحر دروغ دروغ

کسو کے کہنے سے مت بدگماں ہو میرؔ سے تُو
وہ اور اُس کی کسو پر نظر دروغ دروغ

☆☆☆

فصلِ خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گُل
چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقشِ پائے گُل

اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش
جی ہی نکل گیا جو کہا اُن نے ہائے گُل

مقدور تک شراب سے رکھ اکھڑیوں میں رنگ
یہ چشمکِ پیالہ ہے ساقی ہوائے گل؟

بلبل ہزار جی سے خریدار اس کی ہے
اے گُل فروش کروی سمجھ کر بہائے گل

نکلا ہے ایسی خاک سے کس سادہ رُو کی یہ
قابل درود بھیجنے کے ہے صفائے گل

بارے سرشکِ سرخ کے داغوں سے رات کو
بستر پر اپنے سوتے تھے ہم بھی بچھائے گُل

آ عندلیب صلح کریں جنگ ہو چکی
لے اے زباں دراز تو سب کچھ ہوائے گُل

گُل چیں سمجھ کے چنیُو کہ گلشن میں میرؔ کے
لختِ جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گُل

☆☆☆

گل کی جفا بھی جانی دیکھی وفائے بلبل
یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

کر سیر جذبِ الفتِ گُل چیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخِ گُل کو نکلی صدائے بلبل

کھٹکے ہیں خار ہو کر ہر شب دلِ چمن میں
اتنے لب و دہن پر یہ نالہ ہائے بلبل

یک رنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے؟
گُل میں رگیں نہیں یہ ہیں نقشِ پائے بلبل

آئی بہارِ گلشن گُل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

پیغام بے غرض بھی سنتے نہیں ہیں خوباں
پہنچی نہ گوشِ گُل تک آخر دعائے بلبل

یہ دل خراش نالے ہر شب کو میرؔ تیرے
کر دیں گے بے نمک ہی شورِ نوائے بلبل

☆☆☆

مَندا ہے اختلاط کا بازار آج کل
لگتا نہیں ہے دل کا خریدار آج کل

اس مہلتِ دو روزہ میں خطرے ہزار ہیں
اچھا ہے رہ سکو جو خبردار آج کل

اوباشوں ہی کے گھر تجھے پانے لگے ہیں روز
مارا پڑے گا کوئی طلب گار آج کل

ملنے کی رات داخلِ ایام کیا نہیں
برسوں ہوئے کہاں تئیں اے یار آج کل

گلزار ہو رہی ہے مرے دم سے کُوئے یار
اک رنگ پر ہے دیدۂ خوں بار آج کل

کعبے تلک تو سنتے ہیں ویرانہ و خراب
آباد ہے سو خانۂ خُمّار آج کل

حیران میں ہی حال کی تدبیر میں نہیں
ہر ایک شہر میں ہے یہ آزار آج کل

اچھا نہیں ہے میرؔ کا احوال ان دنوں
غالب کہ ہو چکے گا یہ بیمار آج کل

☆☆☆

جانا کہ شغل رکھتے ہو تیر و کماں سے تم
پر مل چلا کرو بھی کسو خستہ جاں سے تم

ہم اپنی چاک جیب کو سی رہتے یا نہیں
پھاٹے میں پاؤں دینے کو آئے کہاں سے تم

اب دیکھتے ہیں خوب تو وہ بات ہی نہیں
کیا کیا وگرنہ کہتے تھے اپنی زباں سے تم

جاؤ نہ دل سے منظرِ تن میں ہے جا یہی
پچھتاؤ گے اُٹھو گے اگر اس مکاں سے تم

قصّہ مرا سنو گے تو جاتی رہے گی نیند
آرامِ چشم مت رکھو اس داستاں سے تم

کھل جائیں گی پھر آنکھیں جو مر جائے گا کوئی
آتے نہیں ہو باز مرے امتحاں سے تم

رہتے نہیں ہو بن گئے میرؔ اُس گلی میں رات
کچھ راہ بھی نکالو سگ و پاسباں سے تم

☆☆☆

سوزشِ دل سے مفت گلتے ہیں
داغ جیسے چراغ جلتے ہیں

اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم
بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں

بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں
جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں

دمِ آخر ہے بیٹھ جا مت جا
صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

فتنہ در سر بتانِ حشر خرام
ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں

نظر اُٹھتی نہیں کہ جب خوباں
سوتے سے اُٹھ کے آنکھ ملتے ہیں

شمع رُو موم کے بنے ہیں مگر
گرم ٹک ملیے تو پگھلتے ہیں

میرؔ صاحب کو دیکھیے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

☆☆☆

اس کے کوچے سے جو اُٹھ اہلِ وفا جاتے ہیں
تا نظر کام کرے رُو بہ قفا جاتے ہیں

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

وقتِ خوش اُن کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو
در و دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں

جائے گی طاقتِ پا آہ تو کر لے گا کیا
اب تو ہم حال کبھو تم کو دکھا جاتے ہیں

ایک بیمارِ جدائی ہوں میں آپھی تس پر
پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

میرؔ صاحب بھی ترے کوچے میں شب آتے ہیں لیک
جیسے دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

☆☆☆ (ا قفا : پیچھے)

مشہور ہیں دلوں کی مرے بے قراریاں
جاتی ہیں لامکاں کو دلِ شب کی زاریاں

چہرے پہ جیسے زخم ہے ناخن کا ہر خراش
اب دیدنی ہوئی ہیں مری دست کاریاں

سو بار ہم نے گُل کے کہے پر چمن کے بیچ
بھر دی ہیں آبِ چشم سے راتوں کو کیاریاں

تُربت سے عاشقوں کی نہ اُٹھا کبھو غبار
جی سے گئے ولے نہ گئیں رازداریاں

اب کس کس اپنی خواہشِ مردہ کو روئیے
تھیں ہم کو اُس سے سینکڑوں اُمیدواریاں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

کیا جانتے تھے ایسے دن آ جائیں گے شتاب
روتے گزرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں

گل نے ہزار رنگِ سخن سر کیا ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

جاؤ گے بھول عہد کو فرہاد و قیس کے
گر پہنچیں ہم شکستہ دلوں کی بھی باریاں

بچ جاتا ایک رات جو کٹ جاتی اور میرؔ
کاٹیں تھیں کوہ کن نے بہت راتیں بھاریاں

☆☆☆

جن کے لیے اپنے تو یوں جان نکلتے ہیں
اس راہ میں وے جیسے اَن جان نکلتے ہیں

کیا تیرِ ستم اس کے سینے میں بھی ٹوٹے تھے
جس زخم کو چیروں ہوں پیکان نکلتے ہیں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ ہیں بھرے سارے
دیکھو نا جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

(ق)

جا گہ سے بھی جاتے ہو منھ سے بھی خشن ہو کر
وے حرف نہیں ہیں جو شایان نکلتے ہیں

سو کاہے کو اپنی تو جوگی کی سی پھیری ہے
برسوں میں کبھو ایدھر ہم آن نکلتے ہیں

ان آئینہ رُویوں کے کیا میرؔ بھی عاشق ہیں
جب گھر سے نکلتے ہیں حیران نکلتے ہیں

☆☆☆

تلوار غرقِ خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں
دیکھیں تو تیری کب تک یہ بدشرابیاں ہیں

جب لے نقاب منھ پر تب دید کر کہ کیا کیا
در پردہ شوخیاں ہیں پھر بے حجابیاں ہیں

اہے ہے آج ہوں میں ہفت آسماں کے اوپر
دل کے مزاج میں بھی کتنی شتابیاں ہیں

جی بکھرے، دل ڈہے ہے، سر بھی گرا پڑے ہے
خانہ خراب تجھ بِن کیا کیا خرابیاں ہیں

مہمان میرؔ مت ہو خوانِ فلک پہ ہرگز؟
خالی یہ مہر و مہ کی دونوں رکابیاں ہیں

☆☆☆

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب بُرائیاں دیکھیں

ترے وصال کے ہم شوق میں ہو آوارہ
عزیز دوست سبھوں کی جدائیاں دیکھیں

ہمیشہ مائلِ آئینہ ہی تجھے پایا
جو دیکھیں ہم نے یہی خودنمائیاں دیکھیں

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

بنی نہ اپنی تو اُس جنگ جُو سے ہرگز میرؔ
لڑائیں جب سے ہم آنکھیں لڑائیاں دیکھیں

☆☆☆

صبر و طاقت کو کڑھوں یا خوش دلی کا غم کروں
اس میں حیراں ہوں بہت کس کس کا میں ماتم کروں

موسمِ حیرت ہے دل بھر کر تو رونا مل چکا
اتنے بھی آنسو بہم پہنچیں کہ مژگاں نم کروں

ہوں سیہ مستِ سرِ زلفِ صنم معذور رکھ
شیخ گر کعبے سے آوے گفتگو درہم کروں

ریزۂ الماس یا مشتِ نمک ہے کیا بُرا
جو میں اپنے ایسے زخمِ سینہ کو مرہم کروں

گرچہ کس گنتی میں ہوں پر ایک دم مجھ تک تو آ
یا ادھر ہوں یا اُدھر کب تک شمارِ دم کروں

بس بہت رسوا ہوا میں اب نہیں مقدور کچھ
وہ طرح ڈھونڈوں ہوں جس میں ربط تجھ سے کم کروں

گو دھواں اُٹھنے لگا دل سے مرے پُر پیچ و تاب
میرؔ اس پر قطعِ ربطِ زلفِ خم در خم کروں

☆☆☆

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں
طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں
رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں

نونہال آگے ترے ہیں جیسے ہوں
ڈالیاں ٹوٹی ہوئیں مرجھائیاں

ایک بھی چشمک نہ اُس مہ کی سی تھی
آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیاں

ایک نے صورت نہ پکڑی پیشِ یار
دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہرائیاں

بوسہ لینے کا کیا جس دم سوال
اُن نے باتیں ہی ہمیں بتلائیاں

مضطرب ہو کر کیا سب میں سبک
دل نے آخر خِفّتیں دلوائیاں

روکشی کی اس کو منھ بھی چاہیے
ماہ کے چہرے پہ ہیں سب جھائیاں

چل چمن میں یہ بھی ہے کوئی روش
ناز تا کے ! چند بے پروائیاں

شوقِ قامت میں ترے اے نونہال
گُل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

پاس مجھ کو بھی نہیں ہے میرؔ اب
دُور پہنچی ہیں مری رسوائیاں

☆☆☆

اب آنکھوں میں خوں دم بہ دم دیکھتے ہیں
نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں

جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد
ہمیں آ کے اُس کے قدم دیکھتے ہیں

گہے داغ رہتا ہے دل ، گہ جگر خوں
ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں

اگر جان آنکھوں میں اُس بن ہے تو ہم
ابھی اور بھی کوئی دم دیکھتے ہیں

لکھیں حال کیا اُس کو حیرت سے ہم تو
گہے کاغذ و گہ قلم دیکھتے ہیں

وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ
اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں

کہاں تک بھلا روؤ گے میرؔ صاحب!
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

☆☆☆

میں کون ہوں اے ہم نفساں! سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح
میں شانہ صفت سایہ روِ زلفِ بتاں ہوں

دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں

تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی
میں صد سخن آغشتہ بہ خوں زیرِ زباں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغِ خزاں دیدہ میں مَیں برگِ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں
درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

خوش باشی و تنزیہ و تقدس تھی مجھے میرؔ
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں

☆☆☆

لیتے ہیں سانس یوں ہم جوں تار کھینچتے ہیں
اب دل گرفتگی سے آزار کھینچتے ہیں

بے طاقتی نے ہم کو چاروں طرف سے کھویا
تصدیع گھر میں بیٹھے ناچار کھینچتے ہیں

منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہو گی
حق جو کہے ہے اُس کو یاں دار کھینچتے ہیں

شکوہ کروں تو کس سے کیا شیخ کیا برہمن
ناز اس بلائے جاں کے سب یار کھینچتے ہیں

ناوک سے میرؔ اُس کے دل بستگی تھی مجھ کو
پیکاں جگر کا میرے دشوار کھینچتے ہیں

☆☆☆

گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو
آرزو ہے کہ تم ادھر دیکھو

عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے
آہ! تم بھی تو اک نظر دیکھو

یوں عرق جلوہ گر ہے اُس منھ پر
جس طرح اوس پھول پر دیکھو

ہر خراشِ جبیں جراحت ہے
ناخنِ شوق کا ہنر دیکھو

تھی ہمہ آرزو لبِ خنداں
سو عوض اس کی چشمِ تر دیکھو

رنگِ رفتہ بھی دل کو کھینچے ہے
ایک شب اور یاں سحر دیکھو

دل ہوا ہے طرف محبت کا
خون کے قطرے کا جگر دیکھو

پہنچے ہیں ہم قریب مرنے کے
یعنی جاتے ہیں دور اگر دیکھو

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میرؔ
دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

☆☆☆

حالِ دل میرؔ کا اے اہل وفا مت پوچھو
اس ستم کشتہ پہ جو گزری جفا مت پوچھو

صبح سے اور بھی پاتا ہوں اُسے شام کو تند
کام کرتی ہے جو کچھ میری دعا مت پوچھو

ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اس کے ایک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو

اشتعالک کی محبت نے کہ در بست پھُنکا
شہر دل کیا کہوں کس طور جلا مت پوچھو

وقتِ قتل آرزوئے دل جو لگے پوچھنے لوگ
میں اشارت کی اُدھر اُن نے کہا مت پوچھو

خواہ مارا انھیں نے میرؔ کو خواہ آپ مُوا
جانے دو یارو! جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو

☆☆☆

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ
وہ نمک چھڑکے ہے مزا ہے یہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

بودِ آدم نمودِ شبنم ہے
ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ

شکر اُس کی جفا کا ہو نہ سکا
دل سے اپنے ہمیں گِلا ہے یہ

شور ہے اپنے حشر پر ہے وہ
یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ

بس ہوا ناز ہو چکا اغماض
ہر گھڑی ہم سے کیا ادا ہے یہ

دیکھ بے دم مجھے لگا کہنے
ہے تو مردہ سا پر بلا ہے یہ

ہے رے بیگانگی کبھو ان نے
نہ کہا یہ کہ آشنا ہے یہ

تیغ پر ہاتھ دم بہ دم کب تک
اک لگا چُک کہ مدعا ہے یہ

نعشیں اُٹھتی ہیں آج یاروں کی
آن بیٹھو تو خوش نما ہے یہ

میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانے
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

☆☆☆

کیا موافق ہو دوا عشق کے بیمار کے ساتھ
جی ہی جاتے نظر آئے ہیں اس آزار کے ساتھ

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

مر گئے پھر بھی کھلی رہ گئیں آنکھیں اپنی
کون اِس طرح مُوا حسرتِ دیدار کے ساتھ

شوق کا کام کھنچا دور کہ اب مہر مثال
چشمِ مشتاق لگی جائے ہے طیار کے ساتھ

ذکرِ گُل کیا ہے صبا! اب کے خزاں میں ہم نے
دل کو ناچار لگایا ہے خس و خار کے ساتھ

کس کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجراں میں دماغ
دل کو اک ربط سا ہے دیدۂ خوں بار کے ساتھ

میری اُس شوخ سے صحبت ہے بعینہ ویسی
جیسے بن جائے کسو سادے کو عیار کے ساتھ

دیکھیے کس کو شہادت سے سرافراز کریں
لاگ تو سب کو ہے اُس شوخ کی تلوار کے ساتھ

بے کلی اس کی نہ ظاہر تھی جو تُو اے بلبل
دم کشِ میرؔ ہوئی اس لب و گفتار کے ساتھ

☆☆☆

کچھ موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

دلی کے نہ تھے کوچے یہ اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اُس کی تو دل آزاری بے ہیچ ہی تھی یارو!
کچھ تم کو ہماری بھی تقصیر نظر آئی

مغرور بہت تھے ہم آنسو کی سرایت پر
سو صبح کے ہونے کو تاثیر نظر آئی

گُل بار کرے ہے گا اسباب سفر شاید
غنچے کی طرح بُلبل دلگیر نظر آئی

☆☆☆

چمن یار تیرا ہَوا خواہ ہے
گُل اک دل ہے جس میں تری چاہ ہے

سراپا میں اُس کے نظر کر کے تم
جہاں دیکھو اللہ اللہ ہے

تری آہ کس سے خبر پایئے
وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے

مرے لب پہ رکھ کان آواز سن
کہ اب تک بھی یک ناتواں آہ ہے

گزر سر سے تب عشق کی راہ چل
کہ ہر گام یاں اک خطر گاہ ہے

کبھو وادیِ عشق دکھلایئے
بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے

جہاں سے تُو رختِ اقامت کو باندھ
یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے

یہ وہ کارواں گاہِ دل کش ہے میرؔ
کہ پھر یاں سے حسرت ہی ہمراہ ہے

☆☆☆

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

چشمِ دل کھول اُس بھی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

نقطۂ خال سے ترا ابرو
بیت اک انتخاب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

☆☆☆

دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے
ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیے

عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا
آدمی ہووے کسی پیشے میں جرأت چاہیے

ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن
سامنے ہونے کو صاحب فن کی قدرت چاہیے

عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو
قرب و بُعد اس جا برابر ہے محبت چاہیے

نازکی کو عشق میں کیا دخل ہے اے بوالہوس
یاں صعوبت کھینچنے کی جی میں طاقت چاہیے

تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
خیریت ہے میرؔ صاحب دل سلامت چاہیے

☆☆☆

تیری گلی سے جب ہم عزمِ سفر کریں گے
ہر ہر قدم کے اوپر پتھر جگر کریں گے

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا
تم حرف سر کرو گے ہم گریہ سر کریں گے

سر جائے گا ولیکن آنکھیں اُدھر ہی ہوں گی
کیا تیری تیغ سے ہم قطعِ نظر کریں گے

اپنی خبر بھی ہم کو اب دیر پہنچتی ہے
کیا جانے یار اُس کو کب تک خبر کریں گے

گر دل کی تاب و طاقت یہ ہے تو ہم نشیں ہم
شامِ غمِ جدائی کیوں کر سحر کریں گے

یہ ظلم بے نہایت دیکھو تو خوبرو یاں
کہتے ہیں جو ستم ہے ہم تجھ ہی پر کریں گے

اپنے ہی جی میں آخر انصاف کر کہ کب تک
تُو یہ ستم کرے گا ہم درگزر کریں گے

صنّاعِ طُرفہ ہیں ہم عالم میں ریختے کے
جو میرؔ جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

☆☆☆

مشہور چمن میں تری گُل پیرہنی ہے
قرباں ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے

عریانیِ آشفتہ کہاں جائے پس از مرگ
کشتہ ہے ترا اور یہی بے کفنی ہے

سمجھے ہے نہ پروانہ نہ تھامے ہے زباں شمع
وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زَدَنی ہے

لیتا ہی نکلتا ہے مرا لختِ جگر اشک
آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے

بلبل کی کفِ خاک بھی اب ہوگی پریشاں
جامے کا ترے رنگِ ستم گر چمنی ہے

کچھ تو ابھر اے صورتِ شیریں کہ دکھاؤں
فرہاد کے ذمّے بھی عجب کوہ کنی ہے

ہوں گرمِ سفر شامِ غریباں سے خوشی ہوں
اے صبحِ وطن تُو تو مجھے بے وطنی ہے

ہر چند گدا ہوں میں ترے عشق میں لیکن
اِن بوالہوسوں میں کوئی مجھ سا بھی غنی ہے

ہر اشک مرا ہے دُرِ شہوار سے بہتر
ہر لختِ جگر رشکِ عقیقِ یمنی ہے

پکڑی ہے نپٹ میرؔ تپش اور جگر میں
شاید کہ مرے جی ہی پر اب آن بنی ہے

☆☆☆

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
اُس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

نہیں آتے کسو کی آنکھوں میں
ہو کے عاشق بہت حقیر ہوئے

آگے یہ بے ادائیاں کب تھیں
ان دنوں تم بہت شریر ہوئے

ایسی ہستی عدم میں داخل ہے
نَے جواں ہم نہ طفلِ شیر ہوئے

ایک دم تھی نمود بود اپنی
یا سفیدی کی یا اخیر ہوئے

یعنی مانندِ صبح دنیا میں
ہم جو پیدا ہوئے سو پیر ہوئے

مت مل اہلِ دوَل کے لڑکوں سے
میرؔ جی ان سے مل فقیر ہوئے

☆☆☆

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اُس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی
کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھُپا کر چلے

بہت آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

دکھائی دیے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

پرستش کی یاں تک کہ اے بُت تجھے
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

نہ دیکھا غمِ دوستاں شکر ہے
ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے

گئی عمر در بندِ فکرِ غزل
سو اس فن کو ایسا بُرا کر چلے

کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے!

☆☆☆